Eik Yaad Jo Kisi Ko Yaad Nahin

ایك یاد جو کسی کو یاد نہیں

Syed Safdar Ali

سید صفدر علی

یہ ہوا کی سرسراہٹ

سب کے لیے کیوں ہے

یہ سورج کی کرنیں جابجا کیوں ہیں

یہ چاندنی، یہ بادل مشترکہ تو نہیں ہیں

پھر کیوں یہ مشترکہ سمجھے جا رہے ہیں

تو آؤ ایك حکم نامہ جاری کریں

کوئی شق، تعزیر عائد کریں

اور طے کر لیں کہ ...

یہ سورج، ہوا اور پانی مشترکہ نہیں ہیں

یہاں کچھ بھی سب کہ لیے یکساں نہیں ہے

اب ہماری نظر میں کوئی انسان نہیں ہے

سوال کے معنی بغاوت میں ملیں گے

سچ کی حقیقت طاقت میں ملے گی

کسی کو کہاں تک ہے دیکھنا

کہاں تک ہے سوچنا

ہم ہی طے کریں گے

بس ہماری اس عطا پر

تمہیں نہ ہے کچھ کہنا

بس خاموش رہنا

ہم تم سے فقط اتنا چاہتے ہیں

منصوبے کا بیان

ہم کیسے پانی کی قیمت طے کر سکتے ہیں؟ ہم کیسے پانی کو سرمایہ داری نظام کا حصہ بنا سکتے ہیں؟ ہم کیسے اس خون چوسنے والے جرم پر خاموش رہ سکتے ہیں؟ میرا کام اس طرح کے سوالوں پر ہے جن پر ہم سب خاموش ہیں، جن کو ہم سب نظر انداز کر بیٹھے ہیں۔ میری کوشش ہے کہ میں لوگوں کو یاد کرواؤں کہ آج جو آپ اپنے حق کی قیمت ادا کر رہے ہیں تو کبھی یہی حق ہر قیمت سے آزاد ہوا کرتا تھا، سب کے لیے یکساں تھا، سب کے لیے مشترکہ تھا۔ بلکل ایسے جیسے سورج اور ہوا مشترکہ ہیں۔ پانی کو بھی مشترکہ ہونا چاہیے، پر وہ مشترکہ رہا نہیں ہے۔ یہ خیال گھر گھر پہچانے کے لیے میں نے بصارتی خط لکھے ہیں جو اسی پانی کے توسل سے گھر گھر پہنچیں گے۔

یہ منظر کشی ہے اُس منظر کی جو منظر اب باقی نہیں رہا۔

میرے شہر کی یادوں میں ایک یاد ایسی ہے جو اب کسی کو یاد نہیں

اور وہ یاد ہے اُس آب کی جس میں سب کہ لیے حیات پلتی تھی

جو سب کہ لیے امرت کا ذریعہ تھی، وہ یاد مشترکہ تھی ۔

پہلا تعارف

پانی پر سب کا مشترکہ حق ہوتا ہے اور یہ حق کافی سال پہلے ٹنڈوجام کے شہری پانی مہیا کرنے والی ٹنکی پر جتاتے تھے۔ پھر یہ حق ٹنکی کی خستہ حالت کو جواز بنا کر سب سے چھین لیا گیا۔ ٹنڈو جام پاکستان کے صوبہ سندھ کے ضلع حیدرآباد کا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہ حیدرآباد سے تقریًبا ۲۱ کلومیٹر کے فاصلے پر، حیدرآباد اور میرپور خاص ہائی وے پر واقع ہے۔

بچپن میں اکثر جب کبھی حیدرآباد سے ٹنڈو جام آ رہے ہوتے تھے تو شہر کو پانی مہیا کرنے والی ۱۵۰ فٹ اونچی ٹنکی کافی دور سے ہی نظر آ جاتی تھی۔ بس کا کنڈکٹر زوردار آواز میں کہتا تھا، " ٽنڊو ڄام اچي ويو آهي" مطلب ٹنڈوجام آ گیا ہے اور وہ آواز اُسی ٹنکی کو دور سے دیکھ کر بس کے کنڈکٹر سے بے ساختہ نکلتی تھی۔ اور اُسی آواز کی سماعت کے بعد ٹنڈوجام کے سارے مسافروں کی نظریں بھی ٹنکی کو دیکھنا شروع ہوجاتی تھیں۔

ٹنکی پر نظر پڑتے ہی اندر ایک احساس جاگ جاتا تھا۔ اُس احساس کو بیان کرنا ممکن تو نہیں پر یوں سمجھیں کہ وہ احساس اُس پرندے کی طرح ہے جو بہت لمبی اڑان کی تھکاوٹ کے باوجود اپنے گھونسلے پر نظر پڑتے ہی اپنے پروں میں تیزی کا اضافہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر چاہے وہ اُڑان میں تیزی لائے یا نہ لائے، اُس ٹنکی پر نظر پڑتے ہی ٹنڈوجام کے باسیوں کا کچھ ایسا حال ہی ہوتا تھا ۔ بس ٹنکی پر نظر پڑتے ہی منتظر نظروں کو گھر پہنچنے کا سکون میسر ہو جاتا تھا۔

اس ٹنکی سے میرا تعلق بچپن سے ہی بن گیا۔ ۱۵۰ فٹ کی اونچائی، ہمیں ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی کی بلندی لگتی جس کو سَر کرنا خواب ہی رہا۔ اکثر گھروں کی چھتوں سے اُس کو دیکھتے رہتے۔گلیوں میں پھیلے ہوئے پانی کے پائپوں پر چلنے کی کوشش میں اکثر پاؤں پھسل جاتے اور ان پائپوں کی حرارت اکثر ٹھنڈی ہی محسوس ہوتی تھی۔

دوسرا تعارف

پرانے وقت میں اس شہر کی اکثر آبادی اپنے پانی کا بندوبست کرنے سے لاچار تھی۔ حالانکہ تب پانی بھی بہتر تھا لیکن ہاتھ والا نل اور مشینی پمپ لگوانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اُس وقت شہر کے عام لوگوں کی مالی حالت بہتر نہ ہونے کی وجہ سے شاید اس شہر کی ٹاؤن کمیٹی نے یہ ٹنکی تعمیر کرائی تھی۔ پورے شہر میں پائپ لائن بچھائی گئی۔ پائپ لائن شہر میں اینٹوں سے بنی ہوئی گلیوں اور راستوں پر کچھ فٹ نیچے دبی ہوئی تھی اور کچھ گلیوں میں لوہے کے یہ پائپ باہر ہی چھوڑے ہوئے تھے۔

ٹاؤن کمیٹی کے مقرر کیے ہوئے پلمبر اور اس سے منسلک دیگر عملہ شہریوں کی آسانی کے لئے موجود ہوتا تھا۔ پانی کے کنیکشن کے لیے ایک درخواست جناب چیئرمین صاحب کو دینی ہوتی تھی جو بہت آسانی سے منظور ہو جایا کرتی تھی۔ پھر ٹاؤن کمیٹی کے مقرر کردہ ملازمین ان پائپوں میں سے گھروں میں کنیکشن کر کے دیتے تھے۔ پانی فراہمی کی مد میں اُس وقت کے مطابق مناسب بل ہر ماہ ٹاؤن کمیٹی میں ادا کرنا ہوتا تھا۔ پانی کی

فراہمی کے مختلف اوقات مقرر ہوا کرتے تھے۔ ٹنکی پر ایک پمپ آپریٹر مقرر تھا جو مشین چلا کر ٹنکی بھرتا تھا اور وہ ہی مخصوص اوقات میں شہر کو پانی فراہم کرتا تھا۔ ٹنکی کے علاوہ ٹنڈوجام شہر میں کچھ پرانے کنویں بھی ہوا کرتے تھے کیونکہ مخصوص اوقات میں پانی کی فراہمی کے سبب شہریوں کی پانی کی ضرورت پوری نہیں ہوتی تھی - ٹاؤن کمیٹی کی طرف سے کچھ ماشکی مقرر ہوتے تھے جو چمڑے سے بنے مشکیزے کنوؤں سے بھر کر شہریوں تک پہنچاتے تھے - ٹاؤن کمیٹی کے ملاز مین اور پمپ آپریٹر اور یہ دوچار ماشکی، یہ سارے کردار ٹنکی اور پانی سے منسلک رہے۔ شہر کا ہر باسی ان کرداروں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور احترام کی زبان سے ان سے گفتگو کرتا تھا۔ شہر کے ہر دکھ اور سکھ میں یہ کردار ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے اس ٹنکی کی پہچان کا انداز ہی الگ ہو گیا تھا - ٹنکی کے بلکل ساتھ میں ایک فوارہ بھی بنا ہوا تھا - فوارے کے برابر میں ایک خوبصورت پارک ہوا کرتا تھا اور اس پارک میں شہتوت کے درخت بہت مشہور تھے۔ کافی سرسبز پارک تھا۔ اِس وقت جس علاقے کو بس اسٹاپ ناکہ کہتے ہیں اُس وقت صرف ٹنکی کے نام سے جانا جاتا تھا۔

تیسرا تعارف

پھر شہر بڑھنے لگا اور جب آبادی ہزاروں سے لاکھوں میں تبدیل ہوئی تو اُس مہرباں ٹاؤن کمیٹی نے اپنی توجہ ٹنکی سے ہٹا دی۔ پھر وہ پارک معلوم نہیں کیسے ختم ہوگیا اور ٹنکی بھی زبوں حالی کا شکار ہوگئی۔ پھر شہر کی شناخت ہی شہریوں کہ لیے خطرے کا جواز بنا دی گئی اورٹا ؤن کمیٹی نے اس خطرے سے نمٹنے کا بس ایک حل نکالا کہ اسے

مسمار کردینا چاہیے۔ نہ اس کی مرمت کی گئی نہ شہریوں سے رائے لی گئی اور اس مشترکہ ساقی کو ہستی سے مٹا دیا گیا۔ نہ کوئی احتجاج ہوا نہ کوئی سوال پوچھا گیا، اور آج شہری پانی جیسی بنیادی سہولت سے محروم ہوکے رہ گئے ہیں۔ شہری صاف پانی پینے کہ لیے فلٹر پلانٹ والوں سے پیسوں پر پانی خریدتے ہیں کیونکہ زمین کا پانی پینے کے قابل نہیں ہے۔ پر جو شہری پانی خرید نہیں سکتے وہ اس زمین کا پانی پینے پر مجبور ہیں۔اس ٹنکی کی باقیات میں سوائے اس آخری نشاں کے کچھ بھی نہیں ہے۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ شاید اس نے زمین کو نہ چھوڑا، یا ہو سکتا ہے زمین نے بھی اسے نہیں چھوڑا۔

یہ زمین ٹنڈوجام کے میروں نے شہریوں کی بنیادی ضروریات کو مِدنظر رکھتے ہوئے پانی کی ٹنکی کے لیے ٹاؤن کمیٹی کے حوالے کی تھی۔ ٹنکی کے مسمار ہونے کے بعد ٹاؤن کمیٹی نے اپنے محکمے کو خسارے کی بنیاد بناتے ہوئے اس کو بیچنے کا فیصلہ کیا تاکہ ٹاؤن کمیٹی کے خسارے میں کمی لائی جاسکے۔ کافی عرصے سے اس ملکیت کے دعویدار سامنے آرہے ہیں جن میں سرِ فہرست ایك سیٹھ ہیں۔ بقول اس ٹنکی آپریٹر کے، جو کافی سال پہلے اپنے فرض سے ریٹائیر ہوچکا ہے، ٹنکی کو ختم کرنے کے بعد یہ زمینی ٹکڑا ایك َبنیے کو دو لاکھ اسی ہزار کے عیو ض بیچ دیا گیا۔ ٹاؤن کمیٹی کے ''ٹی ایم او'' نے اُس رقم میں سے اسی ہزار بینك میں جمع کرائے اور باقی دولاکھ میں سے اُس نے خود کو اور اپنی والدہ کو حج کروایا۔ اس سودے کا ٹاؤن کمیٹی کے پاس کوئی تحریری ثبوت بھی نہیں ہے۔ اب ایك سیٹھ بنا کسی ثبوت کے اس زمینی ٹکڑے پر مالك ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے اور حال ہی میں اس زمین پر ٹریکٹر لاکر صفائی کرائی گئی ہے تاکہ چار دیواری کھڑی کی

جاسکے۔ فرانسیسی فلسفی ژاں ژاک روسو نے کہا تھا کہ عدم مساوات اُس دن شروع ہوئی تھی جس دن پہلے شخص نے کسی زمینی ٹکڑے پر لکیر کھینچتے ہوئے کہا تھا ''یہ میری ہے!''

تو میں نے اس شہر میں ایسی لکیروں کی جانکاری کے لیے جو طاقت کے زور پر کھینچی جا رہی ہیں، ایک سماجی تجربہ کیا۔ میں نے شہر میں پلاٹ اسکیموں کی تفتیش شروع کی۔ میں نے اُسی انداز کو اپناتے ہوئے ایک پوسٹر ڈیزائن کیا جس پر میں نے اپنا نمبر بھی درج کیا اور سوچا اس نمبر کے توسل سے شہریوں سے معلومات ملیں گی اور میں اس ٹنکی کی یاد بطور مرمت استعمال کروں گا۔ میں نے شہر میں اس پوسٹر کو آویزاں کرنا شروع کیا۔ ا س عمل سے اکثر لوگ مجھ سے بس یہ ہی پوچھتے رہے کہ یہ اسکیم کہاں شروع ہورہی ہے اور پلاٹوں کی کیا قیمت ہوگی۔

حالانکہ میں نے لوگوں کی آسانی کہ لیے اس پوسٹر کو بہت صاف لفظوں میں ڈیزائن کیا تھا، اس پورے تجربے میں مجھے سوائے دو کالز کے کوئی بھی کال نہیں آئی اور اُن دو کالز میں ایک شخص نے مجھ سے یہ پوچھا کہ قتل عام کہاں ہو رہا ہے؟ اور دوسرے شخص نے پوچھا کہ یہ اسکیم کس جگہ پر ہے؟ اور پھر جب میں نے ان کی توجہ شہری ملکیتوں پر دلائی تو ان کا کہنا تھا کہ بھائی کسی نے ہمارے گھر پر قبضہ تھوڑی کیاہے تو اس سے ہمارا کیا کام! پھر میرے اس سماجی تجربے کا موضوع شہریوں کی عدم توجہ کی طرف چلا گیا۔

HCP
8992

چوتھا اور آخری تعارف

کوئی ردِعمل نہ آنا بھی میرے لیے ایک ردِعمل تھا۔میں نے اسی بات کو جواز بناتے ہوئے اُس عدم توجہ کو جو میں نے محسوس کی تھی، ایک بصری شکل دینے کی کوشش کی۔ میرے پاس سوائے ایک تصویر کے کوئی اور مواد نہیں تھا۔ چناچہ اسی ایک تصویر کو استعمال میں لاتے ہوئے میں نے ایک بصری خط لکھنے کا سوچا جس میں وہ سارے سوال موجود تھے جو دورانِ تحقیق وجود میں آئے۔

میں نے جب یہ خط گھر گھر پُہنچا نے شروع کیے تو بِالآخر کافی ردِعمل سامنے آیا۔ کسی نے کہا ” آپ کے پانی کا گیلن گُم ہو گیا ہے؟ “ تو میرا بے ساختہ جواب تھا، نہیں، اس گیلن میں میرے شہر کی ٹنکی گم ہو گی ہے ۔کسی نے پوچھا ” پھر سے ٹنکی تعمیر ہو گی ؟ “ میرا جواب تھا، شاید۔ آگے سے ” انشااللّٰہ“ کہہ کر وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔